سبطِ حسن: روشن خیالی اور نویدِ فکر

ڈاکٹر حماد رسول*

Abstract:

Syed Sibt-e-Hassan was a renowned and internationally fame Marxist intellectual journalist and sociologist. Who's work reflects his ideology and thoughts. He played a vital role to promote the reasoning and rationalism. This article reflects a critical view of his marvellous writing named "Naveed-e-Fikr". Syed Sibt-e-Hassan raised many questions about our social, intellectural and educational system and tried to find out the factors which are the main hardles of our intellectural growth and prosperity.

''نویدِ فکر'' کا شمار سبطِ حسن کی فکری و نظری تحریروں میں ہوتا ہے۔ کمیونسٹ نظریۂ فکر جسے سبطِ زندگی خیال کرتے تھے کے فروغ کیلئے بہت کام کیا نہ صرف تنظیمی سطح پر انہوں نے اپنا کردار ادا کیا بلکہ ذہن سازی کیلئے علمی سطح پر بھی نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ جغرافیائی سرحدوں کا دفاع نظریاتی سرحدوں کے دفاع کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔ کمیونسٹ نظریۂ فکر ہر اس فکر کو قبول کرتا ہے جو کہ اپنے اندر دلیل و براہین کا سائنسی نظام رکھتی ہے۔ نقل کو عقل پر فوقیت دینا دانشمندی نہیں کہلاتی اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جو نظریۂ یا فکر آج قابلِ قبول نہیں ہے وہ غلط ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سماجی شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ چیزیں / نظریات واضح ہو کر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ پاپائے روم کے عہد میں ممنوعہ کتابوں اور ان کے مصنفین کو زندہ نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ سرسید اور اقبال پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے جاتے رہے مگر آج ان دونوں حضرات کو نہ صرف تسلیم کیا گیا ہے بلکہ سرکاری سطح پر ان کی تصنیفات

* شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

کی اشاعت بھی عمل میں لائی گئی ہے اور دونوں اصحاب شاملِ نصاب بھی ہیں۔ سو ہمیں اچھی بات کو جہاں کہیں سے بھی ملے عقل کے اوزان پر پرکھتے ہوئے قبول کر لینا چاہیے اور یہی ہمارے روشن خیال اسلاف کا وطیرہ تھا۔

''ہمارے روشن خیال علمائے سلف کا قول تھا کہ یہ نہ دیکھو کہ وہ کون ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔۔۔۔ یہ روش اگر جلد نہ بدلی گئی تو ہم اپنی نئی نسلوں کو شاہ دولہ کے چوہوں کے سوا تحفے میں کچھ نہ دے سکیں گے''۔ (۱)

لفظ ''تھیوکریسی'' اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس سے مُراد ایسی ریاست ہے جس میں حکومت کے قوانین خدا کے بتائے ہوئے اصولوں سے منسوب کئے جاتے ہیں اور جہاں کا حکمران خدا یا اس کا اوتار ہوتا ہے۔ سبط حسن تھیوکریسی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تھیوکریسی وہ ریاست ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ملک کے باشندے نہ ہوں اور نہ عنانِ اختیار ان کے چنے ہوئے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو بلکہ سربراہ مملکت کسی دوسرے ذریعے سے اقتدار حاصل کر کے احکامِ خداوندی کی ترجمانی کا مدعی ہو''۔ (۲)

سبطِ حسن کے مطابق تھیوکریسی، ملوکیت اور جمہوریت درحقیقت ریاست ہی کی مختلف اقسام ہیں اس لیے بہتر ہے کہ ہم پہلے ریاست کی وضاحت کریں اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ پاکستان اور ہمسایہ برادر ملک ایران میں اسلامی ریاست کے ذکر سے بعض طبقوں کا یہ خیال ہے کہ شاید اسلام قبول کرتے ہی ریاست یکسر بدل جائے گی جو سراسر لغو ہے۔ ریاست سے مراد کسی علاقہ کی سب سے طاقتور سیاسی تنظیم ہوتی ہے جو وہاں کے رہنے والے باشندوں کو اپنی طاقت اور نظریات کی قوت سے اپنے اشاروں پر اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق چلاتی ہے۔ سبطِ حسن اس بات پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ریاست ایک دم سے وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے ارتقاء میں چھ ہزار سال کا طویل عرصہ شامل ہے۔ ریاست کا وجود اس وقت عمل میں آیا جب معاشرہ طبقات میں منقسم ہو گیا اور ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئے جو کہ ارتکازِ دولت کے ساتھ ساتھ ارتکازِ طاقت کا بھی موجب تھے۔ ریاست سے قبل قبائل، برادریاں اور گھرانے وجود رکھتے تھے۔ جن میں طبقات نہیں تھے ان کے اصول وضوابط معاشرتی احتیاجات کے تحت تشکیل پا گئے تھے۔ خاندان کا بزرگ ہی اس کا سربراہ تصور کیا جاتا تھا۔ جبکہ ریاست میں ایک سے زائد طبقات کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ کسی خاص اور متعینہ حدود کے اندر ہوتی ہے اس لیے اس کا بنیادی مقصد حاکم طبقہ کا بچاؤ ہے۔ تھیوکریسی مذہبی پیشواؤں کا بچاؤ کرتی ہے جبکہ ملوکیت بادشاہت کا بچاؤ کرتی ہے، بورژوا جمہوریتیں سرمایہ دار طبقہ کی محافظ ہوتی ہیں اور سوشلسٹ ریاستیں محنت کش طبقوں اور عوام کے مفاد کا تحفظ کرتی ہیں۔

''بادشاہ کی شخصیت کے گرد تقدس کا جو ہالہ ان پروہتوں نے چھ ہزار برس پہلے کھینچا تھا

ملوکیت کے زوال تک مشرق اور مغرب میں تھوڑے تھوڑے فرق سے ہر جگہ بدستور قائم رہا۔''(۳)

پروہت راج میں ریاست کا انتظام و انصرام اور مذہبی معاملات دونوں ایک ہی سربراہ کو دیکھنا ہوتے تھے۔ ریاست کا حاکم ہی مذہب پیشوا بھی ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ خداوند کا نائب ہوتا تھا اس لحاظ سے وہ مذہبی معاملات و قوانین میں خداوند کے سوا کسی کو بھی جوابدہ نہ تھا مگر ریاستی امور میں اسے مجلسِ شعوریٰ کے فیصلوں کی پابندی کرنا ہوتی تھی مگر یہ نظام بھی زیادہ دن قائم نہ رہ سکا۔ عہد ملوکیت میں بادشاہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ مگر قانون سازی اور عدلیہ کے معاملات مذہبی طبقہ کے سپرد تھے جو مذہبی نظریات کے مطابق غلط اور صحیح کی تمیز بتلاتے تھے۔ اس تقسیم سے بادشاہ کو ریاست کے ایک بڑے اور مضبوط طبقہ کا تعاون حاصل ہوگا۔ پر ایک ایسا معاہدہ طے ہوا جس کی پاسداری دونوں اطراف سے کی گئی کہ دونوں کے مفادات اس میں پوشیدہ تھے۔ بادشاہوں نے اقتدار میں آنے کے بعد مذہبی طبقوں کو نوازا اور عبادت گاہوں کی املاک کو ضبط نہ کیا بلکہ عوام کو ان عبادت گاہوں کی مرتب اور دیکھ بھال کیلئے ترغیب دی اور بادشاہ خود بھی ان عبادت گاہوں کی تعمیر میں حصہ لیتا۔ جواب میں مذہبی عمائدین بادشاہوں کی مدد کرتے اور لوگوں کو ان کا تابع فرمان بنانے میں کردار ادا کرتے۔ سبط اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چنانچہ اسلامی دور میں بھی بادشاہوں کو ظلِ اللہ (خدا کا سایہ) کا لقب ملا۔ قاضی ماوردی نے ''احکام السلطانیہ'' میں امام غزالی نے ''نصیحت الملوک'' میں نظام الملک طوسی نے ''سیاست نامے'' میں ابونصر فارابی نے ''آلا رامدینۃ الفاضلۃ'' میں ابن خلدون نے ''تاریخ'' میں اطیعواللہ اطیعوالرسول اوراولی الامر منکم کی غلط اور غیر تاریخی تفسیر کی آڑ میں حاکمِ وقت کی اطاعت کا جو سبق مسلمانوں کو دیا وہ غیر مسلم مذہبی پیشواؤں کی تلقینوں سے چنداں مختلف نہیں''۔(۴)

پروہتوں اور مذہبی طبقہ کی راستی امور میں بڑھتی ہوئی عمل داری اور عوام پر اُن کی گرفت نے دونوں کے درمیان نزاع کی کیفیت پیدا کر دی۔ عیسائیت میں پوپ بادشاہ سے زیادہ طاقت اور قوت اختیار کر گیا تھا اور تصرف اس حد تک بڑھا کہ چرچ نے ظلم و جبر کی کئی ہولناک داستانیں رقم کیں۔ کلیسا کے اس ہزار سالہ عہد کو عہد تاریک سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں علوم وفنون ختم ہو کر رہ گئے تھے اور عقل وخرد پر پابندی نے سماج کو زوال سے دوچار کر دیا تھا۔

''مغربی مورخین کلیسا کے ہزار سالہ اقتدار کو ''عہدِ تاریک'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہاں چوتھی صدی سے چودھویں صدی تک تعصب' تنگ نظری اور توہم پرستی کا اندھیرا چھایا رہا کلیسا نے عقل وخرد پر پہرے بٹھا رکھے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ

کلیسائی عقائد سے سرمو اختلاف کر سکے۔ ہر جگہ مذہبی عدالتیں قائم تھیں جن کے فیصلوں کی داد تھی نہ فریاد چنانچہ لاکھوں بے گناہ بے دینی اور جادوگری کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ ان کو ٹکٹکی پر باندھ کر پہلے کوڑے لگائے جاتے تھے پھر ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں۔ ان کی لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا جاتا تھا اور تب چتا میں جلا دیا جاتا تھا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی تھی اور ان کا مال و متاع ضبط کر لیا جاتا تھا۔ یورپ کا ہر فردِ بشر، جس کو بادشاہوں کی براہِ راست سرپستی حاصل نہ تھی مذہبی عدالتوں کے خوف سے کانپتا رہتا تھا''۔ **(۵)**

لیکن پھر تبدیلی آئی اور یورپ بالخصوص اٹلی میں صنعت و حرفت کا آغاز ہوا اور تجارت کے فروغ سے حالات میں بدلاؤ آنے لگا کلیسا اور فیوڈل ازم کو گہری زک لگی۔ بادشاہوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاجروں اور سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی کی۔ امریکہ اور ہندوستان کے بحری راستوں کی دریافت سے بین الاقوامی تجارت کی داغ بیل پڑی اور ساتھ ہی نوآبادیاتی نظام کی بھی بنیاد پڑی۔ اسی دوران جرمن میں چھاپہ خانہ ایجاد ہوا۔ کتابوں اور رسالوں کی اشاعت سے کلیسا کی گرفت مزید کمزور ہوگئی اور لوگوں کو عقل و شعور عطا ہوا۔ برطانیہ نے تھیوکریسی کو ختم کرنے کی ابتداء کی اور انقلاب فرانس نے تھیوکریسی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

تھیوکریسی کے اس احوال سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہ کوئی آسمانی قانون نہیں بلکہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ریاستی اور تاریخی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی اور ان ضروروں کے ختم ہوتے ہی اپنی موت آپ مرگئی۔ اب اگر کوئی تھیوکریسی کو نافذ کرنے کی بات کرتا ہے تو وہ درحقیقت جمہوری قدروں کی نفی کرتے ہوئے آمرانہ فکر کے نفاذ کی بات کرتا ہے جو کہ عوام دشمنی پر موقوف ہے۔ سبط لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک میں ان دنوں سیکولرازم کی اصطلاح کے ساتھ یہی ناروا سلوک ہو رہا ہے۔ ملاؤں کا تو ذکر ہی کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے سیاسی لیڈر اور اخباروں کی ایڈیٹر حضرات بھی لوگوں کو سیکولرازم سے بدگمان کرنے کی غرض سے اس کے معنی و مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گویا سیکولرازم طاعون کا چوہا یا چھوت کی بیماری ہے جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیے۔ ان کے خیال میں سیکولرازم ایک عفریتی نظام ہے جس سے بے دینی، دہریت اور بداخلاقی پھیلتی ہے اور فتنہ و فساد کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا سیکولر خیالات کا سدِ باب نہایت ضروری ہے ورنہ اسلام اور پاکستان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے''۔ **(۶)**

کتاب کے دوسرے مضمون ''اسلامی ریاست'' میں سبط حسن نے اسلامی ریاست کے قیام اور بنیادی عناصر پر سائنسی طرزِ فکر کے تحت بحث کی ہے تاکہ سماج میں پروان چڑھنے والی یہ فکر کہ اسلامی ریاست کا قیام ہی

شاید ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے اور یہ ریاست شاید خدا اور اسکے رسولؐ کے حکم کے عین مطابق ہے۔ کا عقلی استدلال تلاش کیا جا سکے۔

سماجی اداروں اور عقائد و نظریات کا جائزہ ہمیشہ تاریخی تناظر میں کرنا چاہیے تا کہ حقیقتوں تک رسائی ممکن ہو سکے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کے تحت علمائے سلف نے آیاتِ قرآنی کے شانِ نزول دریافت کیں اور سچائی کو لوگوں کے سامنے لے کر آئے۔ علامہ اقبال بھی کائنات کے حرکی نظریہ کے قائل ہیں وہ جمود کی نفی کرتے ہوئے حرکت و تغیر کا درس دیتے ہیں اور نقل پر عقل کو فوقیت دیتے ہیں وہ لوگوں کو اجتہاد کی طرف لانا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں زندگی کی روحانی اساس حرکت و تغیر پر قائم ہے۔

اگر ہم حقیقت کو زمان و مکان کے تناظر سے ہٹ کر دیکھیں گے تو غلطی کے مرتکب ہوں گے کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ کل کی حقیقت حال کے پیمانے سے درست ثابت ہو بعینہ کوئی حالیہ حقیقت و صداقت ماضی کے پیمانے سے غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً غلامی کی رسم ماضی میں رائج تھی اور عہد مصطفویؐ میں بھی رائج تھی اب اگر کوئی شخص عہد حاضر کے پیمانوں کے تحت آپ محمد رسولؐ کے اس عمل کو غلط قرار دیں تو یہ بھی اتنا ہی غلط تصور ہوگا جتنا کہ پہلا تصور ہے کیونکہ دونوں ہی غیر تاریخی استدلال ہیں۔

> ''یہی وہ غیر تاریخی طرزِ فکر ہے جس کے تحت بعض حلقے پاکستان میں عہدِ مصطفویؐ اور خلافتِ راشدہ کے انداز کی اسلامی ریاست قائم کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کی حرکی روح کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ انہوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید اور معقولات کے بجائے منقولات ہی کو اسلام سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ریاست کی نوعیت حالاتِ زیست سے متعین ہوتی ہے اور حالاتِ زیست بدل جائیں تو ریاست کا نظام بھی بدل جاتا ہے۔ مدنی ریاست کے احیا کا مطالبہ کرتے وقت ان بزرگوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ جن معروضی حالات میں مدنی ریاست کی تشکیل ہوئی تھی وہ دوبارہ واپس نہیں آ سکتے''۔ (۷)

تاریخی اعتبار سے دیکھیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عہد رسالت سے قبل حجاز کے کسی خطہ میں کبھی کسی ریاست کا وجود نہیں رہا۔ حالانکہ حجاز کے قرب و جوار میں ایرانی، بازنطینی حیرا اور غسان کی عرب بادشاہتیں اور یمن کی ریاستیں وجود رکھتی تھیں جس سے یہ سوال بھی نہیں اٹھتا کہ وہ ریاستوں سے نا واقف ہے۔ مگر اہل حجاز نے کبھی ریاست کے قیام کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ وہ تجارت کی غرض سے اسے ان ریاستوں کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ سرزمین حجاز میں کل تین اہم شہر تھے جن میں مکہ، طائف اور یثرب شامل ہیں سب سے اہم شہر مکہ تھا کیونکہ مذہبی مرکز حرم کعبہ بھی یہیں تھا جس کی وجہ سے اس کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ شہر تجارت کا مرکز بھی تھا۔

مکہ کا نظم ونسق مختلف قبائل کے ذمہ منقسم تھا برقبیلہ اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ آنحضرتؐ مکہ میں آنے والے قبائل کو اسلام کا پیغام سناتے تھے۔ جس کے نتیجہ میں مدینہ سے آنے والے گروہ نے آپ کے پیغام سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا اور آپ کو مدینہ ہجرت کرنے کی دعوت دی۔ مدینہ ہجرت کے بعد آپؐ نے مہاجرین کی آبادکاری کو ممکن بنایا۔ اسلام کے پیغام کو زیادہ تیزی سے پھیلایا۔ قریش کی تجارتی بالادستی کو ختم کیا اور قرب وجوار کے قبائل سے امن اور صلح کے معاہدے کیے۔ جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ ان معاہدوں میں میثاق مدینہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے بعد تمام قبائل نے آپؐ کا حکم تسلیم کرلیا اور مدینہ کو امن کا گھر قرار دے دیا گیا۔ میثاق مدینہ کے بعد جنگ بدر ہے جو کہ نہایت اہم تاریخی واقعہ ہے کہ جس کے بعد مدینہ میں مدنی ریاست کا بیج بو دیا جاتا ہے۔ مال غنیمت کل کا کل مہاجرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ بنونضیر کے اخراج اور بنوقریظہ کے قتلِ عام کے بعد تمام زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں۔ یوں مدینہ اب خالص مسلمانوں کا شہر بن جاتا ہے۔

> ''اب آپؐ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے اہلِ مدینہ کے مذہبی پیشوا ہی نہیں بلکہ شہر کے حاکم اعلیٰ بھی ہیں۔ زمین پر ریاست کا بیج پڑ چکا ہے اور انکھوے پھوٹنے لگے ہیں۔ اسی سال قرآن کی رُو سے وراثت کا قانون نافذ ہوتا ہے۔ مدینے کے قرب وجوار کے صحرانشینوں سے امن وامداد باہمی کے معاہدے کیے جاتے ہیں اور آنحضرتؐ کے سفیر ایران، مصر، قسطنطنیہ، یمن اور غسان کو اسلام قبول کرنے کا پیغام لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ خطوط اللہ کے رسول محمدؐ کی جانب سے ہیں۔ ان خطوں میں نہ تو کسی ملک کی طرزِ حکومت پر اعتراض کیا گیا تھا اور نہ کسی مخصوص طرزِ حکومت قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا''۔ **(۸)**

سبطِ حسن یہاں پر بنیادی سول اٹھاتے ہیں کہ کیا اسلام کا مقصد ریاست کا قیام تھا؟ یا آپؐ تھیوکریسی قائم کرنے کیلئے یہاں آئے تھے؟ یا خدا کسی خاص ریاست کو درست تصور کرتا ہے؟

> ''لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کا مقصد ریاست قائم کرنا تھا۔ کیا خدا کسی مخصوص ریاستی نظام کو درست اور بقیہ کو نادرست سمجھتا تھا اور کیا آنحضرت صلعمؐ دنیا میں تھیوکریسی قائم کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے؟ تاریخ ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتی ہے اور عقل اس نفی کی تائید کرتی ہے۔ خدا کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ کسی ریاست کا نظام شاہانہ ہے۔ آمرانہ ہے، جمہوری ہے یا اشتراکی۔ اگر خدا کی مرضی یہ ہوتی کہ فلاں نظام ریاست رواج پائے تو وہ انسان کو ابتدا ہی میں اپنی مرضی سے آگاہ کر دیتا اور پچھلے پانچ چھ ہزار برس سے تھیوکریسی، ملوکیت، آمریت، جمہوریت اور شتراکیت

کے جو تجربے ہو رہے ہیں ان کی ضرورت ہی نہ پیش آتی''۔(۹)

تاریخ کا طالب علم بتا سکتا ہے کہ مدنی ریاست کا قیام کسی حکم کے تابع نہ تھا بلکہ یہ قیام تو ان سیاسی ومعاشرتی حالات میں آنے والے تغیرات کا نتیجہ تھا۔ یہ کسی فرد واحد کی خواہش کا بھی نتیجہ نہ تھے اور نہ ہی محمد رسول اللہؐ نے اس کے باقاعدہ قیام کا کبھی ارادہ کیا تھا۔

> ''سرزمین حجاز میں ریاست کا ظہور وہاں کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلیوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ مدنی ریاست رفتہ رفتہ انہیں تاریخی عوامل کے بروئے کار آنے سے وجود میں آئی جن کے باعث بعض اوقات چھوٹی بستیاں شہروں میں اور شہر شہری ریاستوں میں تبدیل ہو گئے۔ یہ تبدیلیاں کسی فردِ واحد کی خواہشوں یا کوششوں کی مرہون منت نہ تھیں بلکہ معاشرتی حالات ان کا سبب تھے۔ آنحضرتؐ کبھی نہ ریاست قائم کرنے کے آرزومند ہوئے، نہ انہوں نے ریاست قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور نہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کی البتہ مدینے کے حالات ہجرتِ نبوی کے بعد ایسی صورت اختیار کرتے چلے گئے کہ ریاست کا قیام ناگزیر ہو گیا''۔(۱۰)

سبطِ حسن اس بات پر بھی سوال اٹھاتے ہیں کہ ہمارے بہت سی مذہبی جماعتیں قرآن وحدیث کی غلط تعبیر وتشریح کے ذریعہ سے حاکمِ وقت کی اطاعت کا جواز فراہم کرتی ہیں آیات قرآنی سے اپنی مرضی ومنشا کے استدلال کی یہ روایتِ قبیح بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد سے جاری ہوئی جو آج تک جاری ہے۔ حتیٰ کہ امام غزالی (۱۰۵۸ - ۱۱۱۱) جیسا عالم دین بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔

> ''نظام الملک طوسی تو خیر سلجوقیوں کا وزیر تھا لہٰذا اس کی تصنیف ''سیاست نامہ'' پر حرف زنی فضول ہے لیکن امام غزالی (۱۰۵۸ء۱۱۱۱ء) کا سا عالمِ دین جب آیاتِ قرآنی کے ساتھ یہی ناانصافی کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔سلاطین سے جھگڑا کرنا درست نہیں اور ان سے نفرت کرنا غلط ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم''۔(۱۱)

سیکولرازم کے حوالہ سے اپنے اس مضمون میں سبطِ حسن نے اس کے مفہوم اور تاریخ سے محبت کی ہے۔ ملک کے طول وعرض سے اٹھنے والی اُن آوازوں کو جو سیکولرازم کو کفر اور اسلام کیلئے کسی خطرہ سے تعبیر کرتی ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں کے جواب میں سیکولرازم کا مطالعہ تاریخی اعتبار سے پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ تصورِ حیات نہ تو کسی مذہب کے خلاف ہے اور نہ ہی کسی ریاست کے مذہبی عقائد سے تعرض کرتا ہے۔

''ہمارے ملک میں ان دنوں سیکولرازم کی اصطلاح کے ساتھ یہی ناروا سلوک ہو رہا ہے۔ ملاؤں کا تو ذکر ہی کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے سیاسی لیڈر اور خباروں کے ایڈیٹر حضرات بھی لوگوں کو سیکولرازم سے بدگمان کرنے کی غرض سے اس کے معنی ومفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گویا سیکولرازم طاعون کا چوہا یا چھوت کی بیماری ہے جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیے۔ ان کے خیال میں سیکولرازم ایک عفریتی نظام ہے جس سے بے دینی، دہریت اور بداخلاقی پھیلتی ہے اور فتنہ وفساد کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا سیکولر خیالات کا سدِ باب نہایت ضروری ہے ورنہ اسلام اور پاکستان دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے''۔ **(۱۲)**

یہ خالصتاً مغربی اصطلاح ہے اور لاطینی زبان میں سیکولیم کا مطلب دنیا کے ہیں۔ سیکولرازم سے مراد ریاستی سیاست یا نظم ونسق کی مذہب سے علیحدگی ہے اور یہ ایسا نظام تعلیم ہے جس میں دینیات کو تعلیم سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''انسائیکلوپیڈیا امریکانا میں سیکولرازم کی تشریح اور زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق ''سیکولرازم ایک اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے اور الہامی مذہب یا مابعد الطبیعات سے جدا ہے۔ اس کا پہلا کلیہ فکر کی آزادی ہے یعنی ہر شخص کو اپنے لیے کچھ سوچنے کا حق۔ تمام فکری امور کے بارے میں اختلافِ رائے کا حق، تمام بنیادی مسائل مثلاً خدا یا روح کی لاقانونیت وغیرہ پر بحث مباحثے کا حق۔ سیکولرازم یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ موجودہ زندگی کی خوبیوں کے علاوہ کوئی اور خوبی نہیں ہے۔ البتہ اس کا مقصد وہ مادی حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان کی محرومیاں اور افلاس ناممکن ہو جائیں''۔ **(۱۳)**

سیکولرازم کو معاشرتی نظام کیلئے درست سمجھنے سے دین دار بے دین اور موحد اور خدا پرست دہریہ یا منکر نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ نظام تو انسان کو حریت فکر عطا کرتا ہے اور اسے ان فرسودہ اور کہنہ معاشرتی وسماجی نظریات سے آزادی عطا کرتا ہے جو جانے کتنی صدیوں سے انسان کے فکر وعمل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہ توہمات جو کہ ہماری زندگیوں کو مفلوج بنا دیتے ہیں۔ سیکولرازم ہمیں ان سے نجات دلاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نقل اور تقلید کو عقل وخرد پر فوقیت دے دی جائے! ابراہیمؑ بھی اگر اپنے آبائی نظریات کو قطعی رد نہ کر دیتے تو اپنے اسلاف کے مذہب پر ہی ہوتے۔ فکر وعمل کی قوانین قدرت سے ہم آہنگی کا دوسرا نام سیکولرازم ہے ہم اپنے اعمال کیلئے جوابدہ ہیں اور کسی ماورائی قوت کا ہمارے عمل میں کوئی دخل ہیں ہے۔ سائنسی طرزِ فکر سیکولرازم کی کلید ہے جس کے ذریعہ سے کسی چیز کے قبول یا رد کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ الٰہیات سے وابستہ لوگ اس لیے بھی سیکولرازم کی مخالفت کرتے ہیں

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے پاس ان کے اٹھائے ہوئے سوالوں کے جواب نہیں ہیں لہٰذا بہتری اور عافیت اسی میں ہے کہ لوگوں کو اس فکر سے دور رکھا جائے۔

مغربی مفکرین قرونِ وسطیٰ کو عہد تاریک سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیاں نہایت پستی کا شکار تھیں پوپ کا اثر ونفوذ اور عمل دخل زیادہ تھا لوگوں کی آزادی اظہار کی قوت سلب تھی اور چرچ اپنے نظریات وافکار کو مسلط کئے ہوئے تھے۔ جن کے خلاف آواز اٹھانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر پندرہویں صدی میں صورتِ حال تبدیل ہوگئی اٹلی میں سرمایہ داری نظام نے قوت اختیار کی اور سیکولر نظریات وافکار مسلم اسپین اور سسلی کے ذریعہ سے یورپ میں داخل ہوئے سبط حسن اس المیہ پر افسوس کرتے ہیں۔

> ''یہ بڑی تاریخ ساز صدی تھی۔ اسی صدی میں اٹلی میں ابھرتے ہوء سرمایہ داری نظام نے طاقت پکڑی اور سیکولر افکار مسلم اسپین اور سسلی کی راہ سے یورپ میں داخل ہوئے مگر تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس مذہب کے عظیم دانشوروں، الکندی، ابوبکر رازی، بوعلی سینا، ابن ہیثم، خوارزمی، البیرونی اور ابن رشد نے مغرب کو سیکولر خیالات اور نظریات کی تعلیم دی اسی مذہب کے نام لیوا آج سیکولرازم پر اسلام دشمنی کی تہمت لگا رہے ہیں''۔ (۱۴)

قرون وسطیٰ کے جن مسلمان حکما نے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا اُن میں ابوبکر رازی اور ابن رشد، سرفہرست ہیں۔ اہل مغرب نے ارسطو کو ابن رشد کے توسط سے جانا اور ارسطو کی کتابیں طبیعات، مابعد الطبیعات پر ابن رشد کی تحریر کردہ شرحوں نے کلیسائی عقائد کے ایوانوں میں ہلچل بپا کردی تھی، برصغیر میں سرسید احمد خان کی تعلیمات نے کہرام مچا دیا تھا۔ مذہبی طبقہ کی طرف سے اُن پر ملحد اور نیچری ہونے کا فتویٰ صادر کیے گئے مگر انہوں نے اپنی روش کو ترک نہ کیا اور حیرانی کی بات ہے کہ ولیم میور کی کتاب جو کہ آنحضرتؐ کے بارے میں لکھی گئی تھی کا جواب اس وقت کے مسلمائے دیو بند میں بھی دینے کی سکت نہ تھی اور یہی نیچری تھا جس نے اس کتاب کا نہایت مدلل اور مبسوط جواب دیا تھا۔ قائداعظم کی خواہش بھی ایک ایسی ریاست کا قیام تھا جس میں سیکولر طرزِ حکومت ہو اور فرد کو مکمل آزادی ہو کہ وہ اپنی زندگی کو کس محور پر بسر کرتا ہے۔ مذہب فرد کا ذاتی مسئلہ ہو نہ ریاست کا۔ مگر افسوس کے قائد کا خواب شرمندہ نہ ہوا۔

وادیٔ سندھ کی دھرتی انقلاب کی دھرتی ہے اس نے اتنے نشیب وفراز دیکھے ہیں کہ عالم میں کم ہی کسی نے دیکھا ہوگا۔ یہ صوفیوں، سنتوں اور سادھوؤں کی سرزمین بھی ایسے صوفیا جنہوں نے نہ صرف لوگوں کو انسان دوستی کی تعلیم دی بلکہ ظالموں کے آگے سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ بھی دیا۔ جو وقت کی بڑی سے بڑی قوت سے بالا خوف وخطر ٹکرا گئے۔ انہی میں ایک نام شاہ عنایت اللہ کا ہے جن کا مزار ٹھٹھہ شہر سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر جھوک نامی بستی میں

زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال نے سندھ کے حالات کو ابتر بنا دیا تھا۔ بالخصوص اس زرعی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ زمیندار اور کاشت کار دونوں بے چین تھے۔ ایسے حالات میں صوفی عنایت شاہ نے جھوک میں تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور چونکہ سندھ کے زیادہ تر صوفیا اور سادات مکمل طور پر دنیا دار بن چکے تھے اس لیے صوفی عنایت کے گرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ صوفی عنایت نے اپنے مریدین کو صبر وقناعت کی تلقین کرنے کی بجائے عمل کی طرف راغب کیا۔ صوفی عنایت نے اپنے مریدین کو اجتماعی کھیتی باڑی کا مشورہ دیا جو انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا اور جھوک میں آباد فقیروں کو نہ بٹائی دینا۔ نہ بے گار کرنی پڑتی اور پٹواری قانون گو کو کچھ دینا پڑتا۔ صوفی عنایت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور سادات نلڑی کے فقیر بھی صوفی عنایت کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ ان حالات کے موجب وہاں کے زمینداروں نے صوفی عنایت کے خلاف مرکز کو لکھ بھیجا۔ چنانچہ ٹھٹھہ کے صوبہ دار نے وہاں کے زمینداروں کو اجازت دے دی کہ وہ جسے چاہیں صوفی عنایت سے نبٹ لیں۔ شہ پا کر زمینداروں نے ان پر حملہ کر دیا مگر منہ کی کھا کر واپس آئے مستزاد کہ فقیروں کے قتل کے بدلے میں اپنی زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کے بعد فرخ شہر بادشاہ کے حکم پر اعظم خان کو صوبیدار مقرر کر دیا جس نے زمینداروں کے ہاتھوں میں آ کر جھوک کا محاصرہ کر لیا۔ مگر فقیروں کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور کوئی تدبیر کارگر ہوتے نہ دیکھ کر فریب سے کام لیتے ہوئے صلح کے بہانے صوفی عنایت کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ میں فقیروں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ سبطِ حسن صوفی عنایت کے حوالہ سے رقمطراز ہیں۔

> ''یہ محاکمہ اپنی جگہ لیکن صوفی شاہ عنایت کا یہی تاریخی کارنامہ کیا کم ہے کہ انہوں نے اجتماعی کھیتی کا کامیاب تجربہ کر کے ثابت کر دیا کہ زمیندار اور جاگیردار حائل نہ ہوں تو کھیتی باڑی زیادہ خوش اسلوبی سے ہوسکتی ہے اور رقابت ودشمنی کے بجائے یگانگت اور امدادِ باہمی کے جذبات فروغ پاتے ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ ریاست کی قوتِ قاہرہ حق وانصاف کی حمایت کرنے کے بجائے اب تک ہمیشہ عوام کے خلاف اونچے طبقوں کے مفاد کی حمایت کرتی رہتی ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ تاریخ کی درسی کتابوں میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر تو بڑی شدومد سے کیا جاتا ہے لیکن ہماری نئی نسل صوفی شاہ عنایت شہید کے نام سے بھی واقف نہیں''۔ (۱۵)

''غلطی ہائے مضامین'' کے باب میں مولانا کوثر نیازی جو کہ سبطِ حسن کے ساتھ پابند سلاسل بھی رہ چکے تھے اپنے ایک مضمون میں مولانا مفتی محمد شفیع سے عقیدت کے سبب جنوں کا قصہ رقم کر دیا جس پر سبطِ اور اُن کے درمیان خوبصورت بحث چھڑی جو اپنی جگہ پر نہایت علمی بحث ہے۔ توہمات وہم سے عبارت ہوتے ہیں اور وہم جن

کے بارے میں درجہ یقین حاصل نہ ہو اور نہ ہی اُن کے وجود کی روشن دلیل موجود ہوتی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ عقیدے بے دلیل تسلیم کرنے کا نام ہوتے ہیں۔ عقیدت میں انسان آنکھوں کو بند کر دیتا ہے اور باطنی آنکھ سے جو نظر آتا ہے اس پر یقین کرتا ہے اور کیا، کیوں اور کیسے جیسے سوالات کے جوابات اس کے پاس نہیں ہوتے۔

> ''عقیدے کے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ کیوں کہ عقیدہ نام ہے تسلیم و رضا کا، اقرار و تقلید کا، روایتوں کے احترام کا۔ اس میں ''کیوں''، ''کیسے'' کی گنجائش نہیں۔ وہ ہم کو ''مان لینے'' کی تلقین کرتا ہے اور بحث، شک اور انکار سے منع کرتا ہے کیوں کہ رجحان اس کے حق میں مفید نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس عقل کا مدار شعور و آگہی پر ہے۔ شعور و آگہی کی اساس عملی تجربے اور مشاہدے ہوتے ہیں۔ انہیں کی مدد سے انسانی عقل نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کی ہیں، وہ چیزیں بنائی ہیں جو کائنات میں موجود نہ تھیں بلکہ قدرتی اشیاء ہی سے ایک نہایت عظیم الشان مصنوعی دنیا تعمیر کر لی ہے''۔ (۱۶)

سبطِ حسن سائنسی طرزِ استدلال کے ماننے والے ہیں اور مولانا کی تمام دلیلیں منقولات پر مبنی ہیں بھلا عقل و خرد کو اپنی سپر بنانے والا منقولات پر کیونکہ اعتماد کر سکتا ہے۔ گفتگو کے آخر میں سبطِ حسن مولانا کی توجہ جس زندہ موضوع اور زندہ حقیقت کی طرح مبذول کراتے ہیں وہ نہایت فکر انگیز ہے انسان کو اپنی توانائیاں ایسے موضوعات پر خرچ کرنا چاہئیں جو انسانیت کی فلاح اور سماجی ترقی کا باعث بن سکیں نہ کہ اُن موضوعات پر جن کا نتیجہ کچھ نہیں آنا کیونکہ عقیدتوں میں تسلیم ہی تسلیم ہوتا ہے اور سوال کرنا راندۂ درگاہ ہونے کے برابر ہے۔

> ''آخر میں مولانا نے میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ حیات بعد الموت کے تذکرے اور جنوں کی داستانیں اپنی جگہ پر لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آٹھ کروڑ زندہ پاکستانیوں کے زندہ مسائل و مصائب سے بحث کی جائے۔ ان کی قوتِ فکر و عمل کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، ان کے علم و شعور میں اضافے کی تدبیریں اختیار کی جائیں اور اُن توہمات کا طلسم توڑا جائے جن میں ہم صدیوں سے گرفتار ہیں''۔ (۱۷)

یوں دیکھا جائے تو سبطِ حسن نے سماج کی ذہن سازی اور فکری تطہیر میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے وہ جانتے تھے کہ جب تک لوگوں کی فکری، شعوری اور علمی سطح کو بلند نہیں کیا جاتا تب تک کسی فعال، سماج اور ریاست کا قیام ممکن نہیں ہے۔ اقتدار سے جڑے ادارے جن میں انتظامی، مذہبی، ریاستی اور عسکری ادارے شامل ہیں کبھی بھی عوام کو عقلی و فکری سطح پر ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یہ ان کے مفادات کے منافی ہے۔ مقتدر طبقہ کی یہی وہ آمرانہ سوچ اور روش ہے جو سماجی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ مذکورہ اداروں اور ان کے پیدا کردہ بیانیہ کے

خلاف اگر کوئی طبقہ کردار ادا کر سکتا ہے تو وہ ادیب اور دانش ور ہیں جو کہ سماج کو نہ صرف سائنسی طرزِ استدلال اور طرزِ فکر عطا کر سکتے ہیں بلکہ کسی متخالف بیانیہ کی تشکیل اور بنیاد بھی۔

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، سید، ''نوید فکر''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص، ۹
۲۔ ایضاً، ص ۶۹
۳۔ ایضاً، ص ۳۵
۴۔ ایضاً، ص ۴۴
۵۔ ایضاً، ص ۴۶ -۴۵
۶۔ ایضاً، ص ۴۷-۴۶
۷۔ ایضاً، ص ۵۱
۸۔ ایضاً، ص ۶۹
۹۔ ایضاً، ص ۷۰-۶۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۷۶
۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۱
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۸۳
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۸۸
۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۱
۱۵۔ ایضاً، ص ۲۹۳
۱۶۔ فیض احمد، فیض، ''پاکستان کے تہذیبی اور سیاسی مسائل''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹-۱۸
۱۷۔ سبط حسین، سید، ''تہذیب کا ارتقاء''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳